

عطیہ اماکی غلطیوں کو پانچ مرتبہ لکھ رہی تھی اور اس نے اپنے نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبارکھا تھا۔ سرور نے کتاب سے نگاہیں ہنا کر سفید پردے کو دیکھا اور پھر سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتاب بند کر کے اس نے تپائی پر رکھی، آہستہ سے اٹھا اور عطیہ کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ اس کی گود میں پڑی ہوئی کاپی پر رکھ دیا۔ تازہ لکھی ہوئی غلطی کی سیاہی اس کی ٹھوڑی پر لگ گئی۔ عطیہ نے کاپی کا کنارہ چھوڑ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور جب سرور نے اپنا چہرہ اور اٹھایا تو عطیہ کو اس کی ٹھوڑی پروشنائی کا نشان نظر آیا۔ اپنے شفون کے سفید ڈوپٹے کو عطیہ نے سیدھی انگلی کے گرد پیٹا اور لب لگا کر نشان ڈور کرنے لگی۔

سرور نے گڑ گڑا کر کہا۔ ”کچھ اچھا نہیں ہوا۔ یہ پڑھنے کا سلسلہ یہ پڑھانے کا مشغلہ۔ مجھے کیا ہو گیا ہے عطیہ؟ یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ کیوں ہو گیا عطیہ۔ اور کچھ اچھا نہیں ہوا۔“

”معطیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”پتہ نہیں۔ میری قسم میں تم سے پڑھنا لکھا تھا۔ تمہاری قسم میں مجھے پڑھانا لکھا تھا۔ میں بھی تو۔ سرور میں بھی تو۔ تم اس طرح نہ کیا کرو۔ پتہ نہیں سرور۔ پتہ نہیں۔“ سرور سن بھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے عطیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”میرا ساتھ تو نہ چھوڑو گی؟ مجھے بھلا تو نہ دو گی؟“

عطیہ نے انگلی کے گرد لپیٹے ہوئے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں میں تمہارا ساتھ کیسے دوں گی۔ کیسے دے سکوں گی تیکن یاد تو میرے اپنے بس کی بات ہے۔ تم کیسے بھلانے جاسکتے ہو۔ تمہیں کون نجھول سکتا ہے۔ میں تو۔ میں تو۔ تمہیں تو کوئی بھی۔“ اس کے آنسو بھر آئے اور وہ یوں نہ سکی۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دو ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی بات گھوم رہی تھی۔ دو وقت مل رہے تھے، شام در پیجوں اور دروازے کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی اور شفون کے برائق دوپٹے کا نیلگوں داغ معدوم ہو گیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کانج کھل گئے اور عطیہ واپس چل گئی۔ پہلے سرور کا ارادہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ولایت جانے کا تھا لیکن اب اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔

اپنادیس چھوڑنے کو اس کا جانہ چاہتا تھا۔ عطیہ سے جدا ہونے پر اس کی روح کو قرار نہ تھا اور اپنے گاؤں کے لوگوں سے اسے پیار ہو گیا تھا۔ سو بُرڈز بُرڈز نے اس کے وظیفے کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس کا شکریہ ادا کر کے سرور نے انکار کر دیا۔

ہر صبح وہ اپنی بندوق لے کر شکار کی تلاش میں پہاڑوں اور وادیوں میں ماراما را پھرتا۔ جب جانوروں کی کوئی نکڑی اس کے سر پر سے گزرتی تو وہ نالی اور پراٹھا کر ٹھائیں سے فائر کر دیتا اور اس کے کندھے کو بڑا دھکا لگاتا۔ جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر کوئی موٹا تازہ ہڑیاں نمودار ہوتا تو وہ ٹھپپ کر ادھر جانے کے بجائے یونہی چلتا رہتا اور جب ہڑیاں اس کی آہٹ پا کر پہاڑی سے وادی میں کوڈ جاتا تو وہ بلی دباتا، بندوق دعثی اور پہاڑوں سے قبیلہ کی صدم بندھو تی۔ سرور بندوق کھوتا تو ابھی خالی کار توں کتنی دور اڑا دیتا۔ وہ بندی لے سیخ کو لا رکھتے ہوئے خول پر نگاہیں گاڑ دیتا اور مسکرا کر کہتا۔ چلو ایک کار توں اور کم ہوا۔ ایک مصیبت اور کٹی، پھر وہ کسی بڑے سے پتھر پر بینٹ کر عطیہ سے باقی کرنے لگتا اور یہاں باقی کرتے ہوئے نہ اس کے خیال کا سلسلہ ختم ہوتا اور نہ کوئی بات ادھوری رہتی۔ عطیہ ٹچپ چاپ اس کے پہلو میں کھڑی ساری باقیں سنتی رہتی لیکن جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتی اور ایک دن جب سرور کسی ابھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر رُختھنوں کے بل گر گیا اور اس کی بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا پڑی تو اس نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر لیک کر سر اور پراٹھا اور اسے شیلے کی نظم کا ایک بندیاں آکیا۔ عطیہ اس کے سامنے کھڑی تھی، سرور نے رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

مجھے اٹھاؤ

ایک لہر کی طرح، ایک پیٹ کی طرح، ایک بدی کی طرح،

میں زندگی کے خارزار میں گر گیا ہوں۔

اور میرا خون بہہ رہا ہے۔

دونوں وقت مل رہے تھے، پرندے اپنے گھونسلوں میں بسیرا لینے کے لیے

آرہے تھے۔ سرخ و کبود بد لیاں ادھر ادھر تیر رہی تھیں۔ وہ الجما آمیز نگاہوں سے ایک ہی طرف تکے جا رہا تھا اور عطیہ اسے اٹھا نہیں رہی تھی۔

کانج کے آہنی گیٹ پر کھڑے کھڑے اس کی ناگیں سوکھ گئیں، لیکن چپر اسی

نے اسے کر سی پر بیٹھنے کا اشارہ تک نہ کیا۔ جب پہلی چٹ کا کوئی جواب نہ آیا تو اس نے دوسری چٹ بھیجی اور اب تیسرا مرتبہ چپر اسی کو زحمت دینے کی اس کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں گیٹ کے پاس چکر لگا رہا تھا اور چپر اسی کا نفس مونا کرنے کے لیے کوئی مناسب فقرہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک عطیہ برآمد ہوئی۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے دامیں ہاتھ میں کھلا ہوا بن اور بائیس میں لٹکتے ہوئے دوپٹے کا کنارہ تھا اور سورج کی تیکھی کرنوں کے سامنے اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ سرور کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چھا بنا کر بولی۔ ”تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا نا ارجح مجھے معاف کرنا۔ اتنی مصیبت ہے۔“ سرور نے بات کاٹ کر کہا۔ ”خیراب معاف کرتے ہی بن پڑے گی ورنہ میں تو۔ لیکن ہم باقیں کہاں بیٹھ کر کریں؟“

”یہ ساتھ ہی ملاقات کا کرہ ہے۔“ عطیہ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”پر یہاں تو اور بھی۔“

”تو تم میرے ساتھ باہر نہیں جا سکتی ہو؟“ سرور نے پوچھا اور عطیہ بغیر کسی ہچکپاہٹ کے مان گئی۔

ہوٹل کے ایک کیبن میں بیٹھ کر عطیہ نے کہا۔ ”اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں ہوں تو۔!“

”تو تمہیں جرمانہ ہو جائے۔“

عطیہ نے ہنپنے کی کوشش کی، لیکن اس کے چہرے پر پیلاہٹ پھیل گئی۔ وہ دیر تک سرور کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر اسے مخاطب کیے بغیر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔ ”چھپلی اتوار کو بڑے اباجی یہاں آئے تھے۔ انہوں نے میری ملنگی کا ارادہ پکا کر لیا ہے۔ کوئی عزیز الدین ہے۔ جنگ میں اُسیں ہزار روپیہ کملایا ہے اور اب ابجی نے اس کی پاس نیک دیکھ کر اپنا ارادہ پکا کر لیا ہے۔“

”اور تم نے؟“ سرور نے آہستہ سے پوچھا۔

”عین کیا کروں سرور؟“ وہ رونے لگی اور آنسو پوچھتے ہوئے بولی۔ ”پتہ نہیں۔“

وہ کون ہے، کیسا ہے۔ صرف اُسیں ہزار روپیے ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے اور ہوں بھی

تو۔ ہوں بھی تو۔“

سرور نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔ ”تو مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟“
”کروں گی سرور، ضرور کروں گی۔“ اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے اور
اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”پر۔۔۔ پر۔۔۔“

سرور نے بلا سوچے سمجھے کہا۔ ”لو چلو ہم ابھی نکاح پڑھوا لیتے ہیں۔ میں شکار
مار کر لایا کروں گا۔ تم کباب بنایا کرنا۔ ہم خانہ بدو شوں کی طرح پہاڑوں میں رہیں گے۔
سمور کے کوٹ پہنیں گے اور چربی کے چراغ جلایا کریں گے۔“
عطیہ نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔ ”اگر تم بھی بزنس کیا کرتے تو کتنا اچھا
ہوتا۔ اگر تمہارے پاس اتنا ہی روپیہ ہوتا تو اباجی بھی انکار نہ کرتے۔“
سرور نے دکھے دل سے کہا۔ ”لو میرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا اور اگر
ہوتا بھی۔“

عطیہ نے کہا ”یا اگر تم کوئی بڑے آفسر ہوتے۔ لیکن تم نے فوکری کیوں
نہیں کی؟“

”فوکری مجھے اچھی نہیں لگتی۔“ سرور نے میز پر ناخن رگڑتے ہوئے کہا۔
”لیکن اگر تم کہتی ہو تو چلو میں فوکری بھی کر لوں گا۔“
عطیہ خوش ہو گئی۔ اس نے آنسو پوچھ کر کہا۔ ”مرد کماتے ہی اچھے لگتے ہیں۔
ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے مرد تو مرد ہی نہیں لگتے۔“

سرور نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ ہو گی تو جیسا حکم کرو گی، ویسا ہی ہو گا۔“
عطیہ گھبرا گئی۔ اس نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بڑے اباجی
سے کہہ دیا ہے کہ ابھی میں اور دوسال تک شادی نہیں کرواؤں گی۔“
”تو۔۔۔ تو۔۔۔“ سرور نے سر ایک سہ ہو کر کہا۔

”جب تک تمہارے پاس کافی روپے ہو جائیں گے۔ تم ایک ایک پانی جمع
کرتے رہنا اور دوسال بعد اپنی کار میں گاؤں آنا۔ اس وقت تو اباجی انکار نہ کر سکیں گے۔“
سرور سکتے میں آگیا۔ اس نے اپنی انگلی کے ساتھ میز پر اپنیں کا ہندسہ لکھا
اور پھر اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی صفریں بنانے لگا۔ عطیہ اٹھ کر اس کے پاس سرک

آئی اور اس کے لگلے میں بانہیں ڈال کر اپناؤں کا اس کے سر پر رکھ دیا۔ سرور خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی انگلی میز پر چھوٹے چھوٹے دائرے بنارہی بھی اور عطیہ ہو لے ہو لے کہہ رہی تھی۔ ”تم تو کہا کرتے تھے کہ تمہیں مجھ سے اتنا پیار ہے کہ تم میرے کسی حکم سے سر نہیں پھیر سکتے۔ اب تم خاموش کیوں ہو گئے؟ یعنی تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہاری کار کا انتظار کروں گی جسے اب آجی کو دکھانے کے بعد ہم آگ لگادیں گے۔ تمہاری پاس مبک دیکھنے کے لیے بے قرار ہوں گی جس کی ساری رقم ہم غریبوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“

سرور نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے اسی طرح جھولا جھلاتے ہوئے کہا۔ ”قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ دانہ دانہ ہو کر کھٹے بھر جاتے ہیں اور پھوٹی پھوٹی سے جھیل تالاب بن جاتے ہیں۔ تم حوصلہ نہ ہارو۔ کوئی سی بھی نوکری کر لو۔ اللہ ضرور برکت دے گا۔ پھر تم آنسو ر— تم آنا۔۔۔ میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔ تمہارا انتظار۔۔۔ مجھے بھلانے دینا۔۔۔ بھلانے۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔“

اور پروانہ روشنی کی تلاش میں اڑ گیا۔

ایک دن شام کو جب علام حسین ڈاک کا تھیلے لے کر اسٹیشن چلا گیا اور بالو محمد دین کیش گنا کر سیف میں بند کروا گیا۔ سرور نے اپنی نائیں اٹھا کر کھڑکی میں رکھ لیں۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ایک طرف بادشاہ کی تصویر تھی، دوسری طرف عبارت لکھی اور گول کنارے بے شمار آڑے نشان بننے تھے۔ اس نے ان نشانوں کو گننا شروع کیا اور تمیں نشان گن کر تھک گیا۔ چلتی روپیہ رکھ کر اس نے زور سے بجا لیا اور چھوٹے سے ڈاک خانے میں بلکا سارا تعاش پیدا ہوا۔ گرگٹ گرگٹ کوئی بر قی پیغام گزر رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور مور سکی والی میز پر جا بیٹھا۔ چھوٹے سے ڈبے میں ایک آہنی قلم دم توڑتی مچھل کی طرح کٹ کٹ کر ڈکٹ کٹ کٹ کر رہا تھا۔ اس نے فہر کو پیدا ہو لے سے دبایا اور ایک سفید کاغذ چھاپ کر روپیہ اس پر رکھ دیا۔ پھر اس نے روپیہ اٹھایا اور فہر کے برابر رکھ دیا۔

بادشاہ اپنے سامنے چھپی ہوئی فہر دیکھ رہا تھا۔ ”ڈیوائی۔۔۔ ڈی۔۔۔ ایں۔۔۔

12 ستمبر۔ ”سرور نے اپنی الماری کھوئی اور اس میں سے سیونگ بینک کی پاس مبک نکالی۔

اس پر ڈاک خانے کی نہروں کے بے شمار نشان لگے تھے اور آخر میں پانچ سو لکھا تھا۔
 تار کی بر قی روکھم گئی۔ سرور نے پاس بک بند کر کے وہی روپیہ اس کے اوپر
 رکھ دیا اور کرسی کھینچ کر تار دینے لگا۔ اس کی نکلاہت کا گلے ڈاکخانہ نے جواب دیا اور
 سرور نے پیغام بھیجننا شروع کیا۔ رول نمبر ایک سو بتیس۔ ایک سو بتیس۔ بتیس۔
 پانچ سو۔ پانچ سو ایک۔ اگلے ڈاک خانے نے جھنگھلا کر جواب دینا بند کر دیا۔
 پاس بک الماری میں رکھتے ہوئے اور روپیہ واپس حیب میں ڈالتے ہوئے اس
 نے سوچا۔ پتہ نہیں ڈاک خانے والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ شاید میرے پاس استفار کا
 خط بھیجیں۔ اس تار کے بارے میں اوپر پورٹ کر دیں۔ یا شاید۔ یا شاید۔ لیکن
 یا شاید کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

اسے سخت بھوک لگی تھی اور روپیہ وہ بھنوانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ روپیہ جب
 بھنوالیا جاتا ہے تو پھر وہ زوپیہ نہیں رہتا! وہ اسی طرح اپنے کواٹر میں جا کر لیٹ گیا اور
 عطیہ سے باتمیں کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن عطیہ کا وجود اب دھنلا سا ہو گیا، نہ تو
 سرور اس سے کھل کر بات کر سکتا تھا اور نہ وہ پہلی سی محبت بھری نگاہوں سے اس کی
 طرف دیکھتی۔ ان کے درمیان جیسے نقریٰ شیشے کی ایک چادر سی آگئی تھی جو ذرا اسی بات
 کرنے پر بھی جھنجھنا اٹھتی تھی۔ ہریالوں کا شکار کرتے ہوئے مرغابیوں کے لیے
 ٹھنڈے پانی میں اترتے ہوئے ایسی بے شمار شامیں آئی تھیں جب وہ عطیہ سے دور ہوا
 کرتا تھا لیکن اس نے کبھی اس دوری کو اس شدت سے محوس نہ کیا تھا۔ پر اب تو بندوق
 ٹک جانے سے اور شکار کا شوق ختم ہو جانے سے اتنی دوری پیدا ہو گئی تھی کہ اپنے تخلی
 کی مدد بے وہ کبھی بھی اسے پاٹ نہ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا کیونکہ وہ
 ایک ایسا پل تعمیر کر رہا تھا جو ان دونوں کو ملارہا تھا اور ملنے کے بعد جسے وہ دونوں بھک
 سے اڑا رہے تھے۔

ڈاک خانے کے تینوں ڈائیکے اور بابو محمد دین اسے بے حد کنجوس خیال کرتے
 تھے اور جب بھی موقع ملتا وہ اس کی برائی کرتے۔ محمد حسین کو یقین تھا کہ وہ کسی کمینے
 گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جس نے کبھی روپے کی صورت نہیں دیکھی لیکن بابو محمد
 دین اس کی شکل و شباہت سے ہمیشہ بیہی نتیجہ نکالا کرتا کہ وہ ضرور کسی اچھے خاندان سے

تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر کے اسے ہمیشہ کے لیے ذلیل بنا دیا ہے اور باپو محمد دین نے یہ نتیجہ اپنے علم کے زور پر نکالا تھا جو اس نے ڈاک میں آنے والے رسالوں کو کھول کھول کر پڑھنے سے حاصل کیا تھا۔

سیونگ بینک کے اندوختہ سے جب کوئی شخص کچھ رقم نکلوانے آتا تو باپو محمد دین آواز دے کر کہتا۔ ”سرور صاحب یہ برادر پچیس روپے نکلوانے آئے ہیں، انہیں سمجھایے۔“ اور پھر ایک آنکھ مچھ کر محمد حسین کو اشارہ کرتا۔ سرور اپنی کرسی سے اٹھتا اور کھڑکی کے پاس آ کر کہتا۔ ”روپیہ کیوں نکلواتے ہو بھائی، پچیس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ سینکڑے کی ایک چوتھائی۔ روپیہ نکلواؤ نہیں جمع کراتے جاؤ۔ پھر یوں پھویوں جیکھو یوں جھیل تالاب بن جاتے ہیں۔ دانہ دانہ مل کر کھتے بھر جاتے ہیں۔ دیکھو روپیہ نہ نکلواؤ۔ جمع کرو، جمع کرو۔ پھر تمہاری عزت ہو گی۔“ تمہارے خاندان کی عزت ہو گی۔ تمہارے قبصے کی عزت ہو گی۔“ اور وہ آدمی اتنی لمبی تقریریں کر گھبرا جاتا۔ سرور کی یہ تقریریں سارے قبصے کے لوگوں نے سن رکھ تھیں اور چونکہ وہ اس وعظ سے گھراتے تھے، اس لیے انہوں نے سیونگ بینک میں روپیہ رکھنا بند کر دیا تھا۔

کبھی کبھار سرور اپنی کوٹھری میں ادھر ادھر دیکھ کر ایک روپیہ جیب سے نکالتا اور اسے دونوں ہاتھوں کی چنکیوں میں پکڑ کر ہولے سے کہتا۔ ”ایک کے دو، دو کے چار، چار کے آٹھ، آٹھ کے سولہ۔ ہوں۔“ لیکن جب وہ روپے کو زور سے کھینچتا تو وہ پھسل کر کسی ایک چنکی میں ایک کا ایک ہی رہ جاتا!

اول اوقل اس کے جی میں آتی تھی کہ سرکاری سیف کا روپیہ نکال کر بھاگ جائے۔ ایک کار خریدے اور اس میں روپوں کے توڑے رکھ کر گاؤں پہنچ اور سب کچھ بڑے پیر زادہ صاحب کے قدموں میں ڈال دے۔ بعد میں جو ہو سو ہو لیکن ایک دن جب وہ کیش گن رہا تھا اور نوٹوں کو لیچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا تو عطیہ نے روشنداں سے آنے والی روشنی کے ساتھ اُتر کر اسے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر اس نے پھر اس قسم کی بات سوچی تو وہ اس کا انتظار کرنا بند کر دے گی اور شادی کر لے گی۔ اس کے بعد سرور نے بیگانے روپوں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔

سیونگ بینک میں سرور کا حساب بڑی سُست روی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور

اب وہ سوچنے لگا تھا کہ ساری عمر میں بھی یہ رقم نہیں ہزار کوئہ چھوکے گی۔ اس پر بھی وہ بڑی مستعدی اور ثابت قدمی سے روپیہ جمع کر رہا تھا۔ مسلسل فاقوں سے اس کی صحت خراب ہو گئی تھی اور وہ بیمار سار ہے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ اور نائم والی تاروں کے انتظار میں رات گئے تک کر سی پر بیٹھا رہتا۔ دانہ منڈی کے منیم بھاؤ کی تاریں لے کر اس کے پاس آتے۔ بڑے ادب سے سلام کرتے اور رسیدیں لے کر چلے جاتے۔

وہ ایک ایک کر کے ساری تاریں نکال کر تار ہتا اور رات آدمی سے زیادہ بیت جاتی۔ خدا کا شکر تھا کہ ڈبوالی منڈی کے ڈاک خانے میں تعینات ہوا تھا جہاں آدمی تنخواہ سے زیادہ اور نائم کی رقم بن جاتی تھی۔

ایک رات وہ نکشوں والی صندوقچی کھولے رقم گن رہا تھا۔ باہر شدید بارش ہو رہی تھی اور ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کا یہ پھر بھر کی اٹھتا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھاٹکنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صندوقچی کے مختلف خانوں میں دو نیاں، چوتھیاں، اٹھیاں اور روپے پڑے تھے۔ وہ انگلی سے انہیں خانوں میں ادھر ادھر کر رہا تھا اور اس کے پہلو میں فٹ بھر اونچی پھکنی پر ساؤنڈر گرگٹ، گرگٹ کر رہا تھا۔ کہیں دور سے — نمبر کا شادی کی مبارکباد کا تار اس آ لے سے ہوتا ہوا کسی اور شہر کو جارہا تھا۔ کوئی دُور افتابِ شخص اپنے دوست عزیز الدین کے نام پیغام بھجوار ہا تھا۔ پسی میرج — پسی میرج — اور سرور صندوقچی کے خانوں میں اٹھنیوں اور چوتھیوں کے ستوں بنا رہا تھا اور اس کے پہلو سے تار گزر رہا تھا۔ پسی میرج، پسی میرج — اس نے صندوقچی بند کر کے اس کی ٹھنڈی سطح پر اپنا گال رکھ دیا۔ ایک مرتبہ پھر باہر دیکھنے کی کوشش کی اور رحم طلب نگاہوں سے روشنдан کی طرف دیکھ کر کہا۔

مجھے اٹھاؤ۔

مجھے اٹھاؤ — میں زندگی کے خارز ار میں گر گیا ہوں۔

اور میرا خون بہنہ رہا ہے۔

ساؤنڈ میں آہنی قلم نفی میں سر ہلا رہا تھا اور بر قی روکہہ رہی تھی، گٹ، گٹ

گرگٹ، گر، گٹ —

جس شام مہروں کا سال تبدیل کر کے محمد حسین نے کاپی پر انہیں چھپا اور

سرور کے دستخط لینے کے لیے انہیں آگے بڑھا لیا تو اسے دو سال گزر جانے کا احساس ہوا۔ میز کی درازی سے اُس نے اپنی پاس بک نکالی اور بقایا پر نظر ڈالی۔ دو ہزار چار سو نو اسی روپے۔ اس نے اسی قلم سے جس سے وہ کاپی پر دستخط کر کے ہٹا تھا بلا ٹنگ پہنچ پر انہیں ہزار لکھا اور اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ صفریں نو یہی ڈم اور ٹو یہی ڈم کی طرح پیٹ نکالے کھڑی تھیں اور نو کا ایک بیوی جیسا ہندسہ ایک کے ساتھ سر لگائے جھکا ہوا تھا۔ سرور نے قلم میز پر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ جس مقصد کے لیے اس نے یہ کچھ کیا ہے، آیا وہ اس کی زندگی میں پورا ہو بھی سکے گایا نہیں اور اسے یوں لگا ہے اس کی زندگی اس کام کے لیے بہت تھوڑی ہے اور اسے اپنی زندگی کے بعد بھی کئی سال اسی مقصد کے لیے سرگردان رہنا پڑے، شاید وہ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں بھی سوچتا، لیکن اسے اچانک یاد آگیا کہ قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ پھونیوں پھونیوں جھیل تالاب بن جاتے ہیں اور دانہ دانہ مل کر کھتے بھر جاتے ہیں۔

روپوں کے ساتھ روپے جوڑ جوڑ کر تو پاس بک کی رقم میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا لیکن دنوں پر دن گر گر تو سرور کی زندگی میں ایام کا ڈھیر سالگ گیا۔ کبھی کبھی تو اس کے جی میں آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ جائے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ انہی پہاڑوں کے دامن میں جہاں اس نے اپنا بچپن اور جوانی بتائی تھی، ایک چھوٹا سا جھوپڑا بنا کر گزر اوقات کرنے لگے، لیکن پھر اسے عطیہ کی باتیں یاد آ جاتیں۔ وہ اپنے سر کو جنبش دیئے بغیر ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھتا اور کہتا واقعی مرد کام کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اگر وہ کام نہ کریں تو کچھ اچھے نہیں لگتے اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ دن بھر لمبی لمبی رقبیں جوڑ کر شام کو گوشوارہ بنا کر اور ڈاک کا تھیلہ بند کروانے کے بعد وہ نیچ پر میٹھ جاتا اور جب تھکن کا احساس اسے بالکل چور کرو یا تو اس کا جی عطیہ کو خط لکھنے کو چاہتا اور وہ روپ نمبر 132 کے نام ایک خط بھی لکھ دیتا لیکن پھر اسے دیئے کی لوپر جس طرح لاکھ پکھلا کر مہریں لگائی جاتی ہیں، وہ اس خط کو جلا دیتا۔ جلے ہوئے کاغذ کا سیاہ بل فرش پر ادھر ادھر گھومتا اور پاؤں تلے دب جاتا۔

مہروں کی تاریخیں بڑی تیزی سے بدلتی ہی تھیں۔ مہینے بدلتے تھے اور کسی شام سال بھی تبدیل کر دیا جاتا۔ سرور نا امید نہیں ہوا۔ روپے سے اس کو محبت

نہیں ہوئی پر روپیہ جمع کرنا اس کی فطرت میں داخل ہو گیا۔ اسے یوں لگتا جیسے پیسہ پیسہ جوڑتے کتنی صدیاں گزر گئی ہیں۔ کئی جگ بیت گئے ہیں مگر وہ گاڑی جس پر سوار ہو کر اسے منزل مقصود تک پہنچتا ہے، ابھی تک پہیوں کے بغیر ہی ہے۔

مگر ایک شام جب غلام حسین ڈاک کا تھیلا لے کر اشیش چلا گیا تھا اور ڈاک خانے کی ساری کھڑکیاں بند ہو گئی تھیں اور تاز کاڈ بے سار ادن مژہ رانے کے بعد خاموش ہو گیا تھا، سرور کو نہ جانے کیوں پان کھانے کی تمنا ہوئی۔ اس بند کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے سامنے سگر ٹوں کی دکان کو دیکھا۔ لڑکا پان لگا رہا تھا۔ باہمیکلوں کا مستری ٹین کی ٹھری پر بیٹھا سگر پیٹ پی رہا تھا اور گرامون نج رہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نقدی باہر نکالی۔ کل تین روپے بارہ آنے تھے۔ بارہ آنے ڈاک خانے کے تھے اور تین روپے اس کے اپنے۔ بارہ آنے نکلوں والی صندوق تھی میں ڈال کر وہ ڈاک خانے سے باہر نکلا اور سگر ٹیوں والے کی دکان کے پاس جا کھڑا ہوا لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ یہ تو ایک آنے کا پان دیتا ہے اور اشیش یہ دوپیے کا ملتا ہے۔ اس نے مسکرا کر لڑکے سے پوچھا۔ ”کوئی نیاری کارتہ نہیں مل گوایا؟“

لڑکے نے کھالا گاتے ہوئے جواب دیا۔ ”چاچا گیا ہوا ہے۔ میں نے اسے نئے ریکارڈوں کے لیے کہا تو تھا۔ اگر پیسے نج گئے تو ضرور لائے گا۔“ سرور نے ہولے سے کہا۔ ”ہاں پیسے تو ضرور بچانے چاہئیں۔ وقت بے وقت کام آتے ہیں۔ مصیبت میں مدد کرتے ہیں۔“

لڑکا اسی طرح کھالا گاتا رہا اور سرور اشیش کو روانہ ہو گیا۔

اندھیرا چھا رہا تھا۔ اشیش کے کمروں میں لیمپ روشن ہو گئے تھے اور پلیٹ فارم کے گیسوں کو بانس سے نیچے ڈھلان کر ان میں تیل بھرا جا رہا تھا۔ غلام حسین ڈاک کے تھیلے کو گود میں لیے نج پر بیٹھا گاڑی کی راہ تک رہا تھا۔ سرور کو قریب آتے دیکھ کر وہ کھڑا ہوا گیا تو سرور نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”بیٹھی بیٹھی، تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔“ چھا بڑی والے برآمدے سے نکل کر باہر پلیٹ فارم پر آگئے تھے اور ان کے خوانچوں میں کار بائیڈ کے لیمپ خاموشی سے لو دیئے جاتے تھے۔ سرور کا جی آج سیر کرنے کو چاہتا تھا اور وہ پان کھا کر مریل کی پڑی کے ساتھ ساتھ ندی کی طرف نکل آنا

چاہتا تھا لیکن جب سگنل کی سرخ آنکھ بسز ہو گئی تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک نظر گاڑی کا نظارہ کرتے چلیں۔ بڑی دور شبنم اور بولوں کے چھند سے پرے گاڑی کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور اس کے دھنے دھنے وسلوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ سرور پان والے کے پاس گیا اور اچھے سے پتے کا انتخاب کرنے لگا۔ اس نے سارے لگے ہوئے پتوں کی کوریں موڑ کر دیکھیں مگر اس سے کوئی پتہ پسند نہ آیا۔ تسلی میں پڑے ہوئے پتوں میں سے ایک پتا اس نے چھانٹ کر نکالا۔ بڑا اختہ پتا تھا۔ اس نے کلفی میں لکڑی گھمائی اور خود ہی چونا لگانے لگا۔ گاڑی کی دھمک قریب آتی جا رہی تھی اور اس کی شرک میک صاف نالی دے رہی تھی۔ پان لگا کر اس نے روپیہ چھا بڑی والے کی طرف بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے پان فروش نے روپے کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی صدری سے نادان نکلنے لگا۔ ایک چوئی، ایک دولی، ایک آنہ اور ایک ادھنی دے کر اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور اٹھنی نکالی۔ سرور کے ہاتھ میں اٹھنی دیتے ہوئے اس نے گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے اُدھردیکھتے ہوئے پا کر سرور بھی اُدھردیکھنے لگا۔ اٹھنی کا ایک کنارہ سرور کے ہاتھوں سے چھوڑا، پھر وہ پلیٹ فارم کی سل پر گری، بجی، اچھلی اور پھر لائیں میں گر گئی۔ سرور اس کے پیچے لپکا اور پلیٹ فارم کے پیچے اتر گیا۔

گاڑی بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اٹھنی پھر وہ میں جا چھپی تھی۔ لوگ پلیٹ فارم پر شور مچا رہے تھے۔ انجن فلک شگاف و سل دے رہا تھا اور سرور پھر وہ کو بڑی تیزی سے ہٹائے جاتا تھا۔ ایک دم و کیوم لگ جانے سے گاڑی کے پہیوں سے بڑی خوفناک آوازیں نکل رہی تھی۔ گاڑی روکے سے رک نہیں رہی تھی۔ ساری دھرتی کا پسند گئی۔ سرور پسینے میں نہا گیا۔ انجن کا نجمار اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ انجن کی چند ہیا دینے والی روشنی جب لائیں پر پڑے ہوئے پھر وہ پڑتی تو سرور کو ہر سنگریزے کے ساتھ اٹھنی چھپی ہوئی دکھاتی دیتی۔ وہ ہر سنگریزے کی طرف بھاگتا، ہر اٹھنی کی طرف لپکتا اور ہر کرن پر ٹوٹ کر گرتا۔ روشنی! روشنی!! روشنی!!! پرواںے سرگوشیاں کر رہے تھے اور کھر میک کھر کھر۔ کھر ڈیمک۔ ڈیمک۔ کھر ڈیمک۔ کھر ڈیمک۔ کھر ڈیمک۔ رکتا ہوا انجن سرور کی طرف بازو پھیلائے بڑھ رہا تھا۔ کھر ڈیمک۔ ڈیمک۔ کھر ڈیمک۔ ن۔ ن۔ ک۔ ڈیمک۔

حقیقت نیو ش

میری بیچو! سعدی کی سہیلیو! میرے قریب آؤ اور سنو! یہ کہل میری نانگوں پڑاں دو اور آتشدان میں چند لکڑیاں اور جھونک دو۔ آج میں تمہیں وہ بات سنانے لگا ہوں جو تم نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ اور جب میری زبان ہمیشہ کے لیے ٹنگ ہو جائے گی تو پھر تمہیں کوئی بھی ایسی بات نہ سن سکے گا۔ ہتھ بجھا دو اور آخری کھڑکی کھول دو۔ آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری بینائی لوٹ آئی ہے۔ جیسے مجھے دکھائی دینے لگا ہے اور جیسے مجھے تمہارے خدو خال نظر آنے لگے ہیں لیکن تم اس طرح کیوں بیٹھ گئی ہو۔ تم نے تو میری کرسی کے گرد پیچارنوں کی طرح آسن جمالیے ہیں۔ بستر سے تکیے اٹھا لاؤ۔ میرا الحاف لے لو اور یوں بیٹھو کہ مجھے پتہ نہ چلے۔ تم میں سے کوئی بیٹھے، کوئی لیٹ جائے، کوئی نیم دراز ہو اور کوئی اپنی دونوں کہنیاں زمین پر نیک کر ہتھیلیوں کے پیالے میں اپنی ٹھوڑی ڈال لے۔ تمہارے اس طرح بیٹھنے سے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک سکول باسٹر ہوں جس نے چھٹی کے بعد پتوں کو گرا نمر پڑھانے کے لیے روک رکھا ہو۔ دیکھو! جس ٹھنڈی ہوا کے جھونکنے اس کھڑکی سے لپک لپک کر اندر آ رہے ہیں، عین اسی طرح میری برسوں کی بوڑھی اور ٹھنڈی جان بھی اسی کھڑکی کے راستے باہر نکل جائے گی اور جب میں اس کھڑکی سے اس وجود سے باہر نکل جاؤں گا تم روؤگی، چیخوگی، چلاڑگی اور اپنے بوڑھیے داد کو پکاروگی، پر میں واپس نہ آؤں گا اور ٹھنڈی روح ٹھنڈی ہواں کے ساتھ گھل مل جائے گی لیکن اس وقت مجھے کہل اوڑھا دو اور آتشدان میں لکڑیاں ڈالتی چلی جاؤ کیونکہ میں ابھی تک گیا نہیں اور تم سے بتائیں کیے بغیر میں جاؤں گا بھی نہیں۔ سنو! یہ کائنات نا مکمل ہے، انسان نا مکمل ہے اور سب سے

بڑھ کر اس کی زبان ناکمل ہے۔ اگر سوچنے والے دماغ ہوتے۔ اگر پر معنی الفاظ ڈھل
چکے ہوتے تو جمیل کی زندگی یوں نہ گزرتی۔ جمیل مجھے کس قدر عزیز ہے، یہ سعدی
جانتی ہے اور اس کے بارے میں اس نے تمہیں بہت کچھ بتایا ہے۔ باقی جورہ گیا ہے، وہ
میں سنائے دیتا ہوں لیکن یہ بات تم ذرا دھیان سے سننا۔ ویسے ہی دھیان سے جیسے
سعدی میری میز پر بیٹھ کر خط لکھا کرتی ہے اور نہیں جانا کرتی کہ کیا لکھ رہی ہے اور کیوں
لکھ رہی ہے۔ بس اسی طرح تم بھی میری باتوں کو سننا، یہ نہ جانتے ہوئے کہ میں کیا کہہ
رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں کیونکہ جب تم اس طرح بات سنتی ہو تو اس کا ایک ایک
لفظ تمہارے ذہن پر مرتم ہو جاتا ہے اور تم اسے بھلانے پر بھی نہیں بھلا سکتی ہو کہ
فطرت نے تمہیں اس طرح سے ڈھالا ہے!

جمیل اور میں بچپن کے ساتھی تھے اور وہ اپنے آپ کو اتنا بہت جانتا تھا جس
قدر میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ بہمن النسل تھا اور اس کی آنکھوں میں بند توب کی وڈیا کی
جوت تھی۔ اس کے بال سنبرے تھے اور اس قدر بیچ دار تھے کہ کٹھی کے باریک
دندوں والا حصہ ان میں چلنے سکتا تھا۔ کتب کے زمانے میں وہ گلہری کی سی پھرتوں سے
ذرختوں پر چڑھ کر پرندوں کے گھونلوں کو اجاڑا کرتا اور ان سے نیلے اور چستکبرے
انڈے نکال کر مجھے دیا کرتا۔ ان انڈوں کو ہم سرگوں میں بھگو کر گیندوں کی طرح لچکدار
بنایتے اور پھر تنگ منہ کی بوتلوں میں اتار دیا کرتے۔ بوتل میں برف کا خندان اپانی ڈالنے
سے وہ انڈا پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ یہ بوتل میں
اٹرا کیونکر۔ میرے کمرے میں ایسی بہت سی بوتلیں جمع ہو گئی تھیں۔ المباری میں بریکٹ
پر، چارپائی کے نیچے اور کتابوں والے بڑے میز پر بیسیوں ایسی بوتلیں بے ترتیبی سے پڑی
تھیں۔ ایک دن اچانک جمیل نے گھونسلے اجاڑنے چھوڑ دیئے اور وہ درخت پر چڑھنا
بھول گیا۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا، مجھے ذرگلتا ہے کہ کسی دن کوئی انڈا بوتل میں ہی
نہ چٹ جائے اور اس میں سے چڑیا کا ایک ننھا سا بچہ نہ نکل آئے۔

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اس میں ڈر کیا؟"

جمیل نے پریشان ہو کر کہا۔ "لیکن وہ بچہ بڑا کیسے ہو گا، اس کو چو گا کون دے گا
اور پھر وہ اس بوتل میں سے نکلے گا کیسے؟"

اس پر مجھے بڑی ہنسی آئی اور میں نے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔ ”اے ہم چوگا کھلائیں گے اور وہ اسی بوقت میں بڑا ہو جائے گا اور جب ہمارا جی اسے باہر نکالنے کو چاہے گا تو ہم وہ بوقت توڑڈالیں گے۔“ اس پر تھوڑی دیر کے لیے اسے اطمینان ہو گیا لیکن پھر فور انہی گھبرا کر کہا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے پر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کوئی بوقت کہیں رکھ کر بھول جائیں۔ انڈے سے بچے نکلے اور پھر تڑپ تڑپ کر بوقت ہی میں مر جائے۔“ اس پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”فکر مت کرو۔ اول تو ہم بھولتے نہیں اور اگر بھول بھی گئے تو وہ بچے چیزوں چیزوں کر کے ہمیں خود بلائے گا۔“ لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے درختوں پر چڑھنا اور گھونٹے نوچنا چھوڑ دیا۔

ذرا تھہر و میری پیاری بچیوں میں تمہیں اپنے بچپن کے سارے واقعات کیوں سناوں۔ تمہیں اپنی زندگی کی ساری داستانیں کیوں سناوں؟ وقت بہت کم ہے اور رات گزرتی جا رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور آتشدان کی حدت مل جل کر تمہیں اپنی کنگنی گود میں لوریاں دے رہے ہیں اور تم جہاںیاں لینے لگی ہو۔ میں تمہیں صرف چند واقعات بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لوں گا۔ پھر تم انہیں جوڑ کر آپ ہی ایک داستان مرتب کر لینا۔ جمیل کسی کی بات ثال نہ سکتا تھا۔ کتنی کوکھرا جواب نہ دے سکتا تھا اور کسی کو منہ چھاڑ کر ”نہیں“ نہ کہہ سکتا تھا۔ اگر وہ نہ کہنے کا عادی ہوتا یا اس میں سر ہلا کر انکار کر دینے کی جرأت ہوتی تو آج تم سب کو جمع کر کے اس کی کہانی بیان نہ کرتا۔ جمیل دراصل وہ نہ تھا جو دنیا اسے سمجھتی رہی۔ وہ دراصل وہ تھا جس کے لیے کسی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا اور جس کی وضاحت کے لیے کوئی ترکیب یا بندش ڈھانی نہیں جاسکتی۔

دو سویں جماعت میں اسے اپنی بنتِ عم سے بڑی خطرناک قسم کی محبت ہو گئی اور وہ ہر لمحہ پر یثاب رہنے لگا۔ اس نے اس کی یاد میں تڑپا دینے والے شعر لکھے۔ اس کی تعریف میں لمبی لمبی نظمیں لکھیں۔ لیکن ان دونوں کو داگئی رفاقت میسر نہ آئی۔ قصور ایسے چھوٹے سے شہر میں زبیدہ اور اس کی ای اپنے آبائی مکان میں زندگی گزار رہی تھیں اور زبیدہ کا بھائی جو فیروز پور آر سل میں ایک معمولی ٹکر ک تھا، ان کی کفارالت کرتا تھا۔ ان کے کسی قربی عزیز کی شادی تھی اور یہ دونوں کہنے ہو شیار پور جا رہے تھے۔ جمیل کے ابا نے مناسب سمجھا کہ وہ قصور سے ہوتے ہوئے چلیں اور اپنی بھاوج

کو بھی ساتھ لیتے جاویں۔ جب یہ لوگ لاہور سے بس کے ذریعے قصور پہنچ تو گاڑی کے روانہ ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی زبیدہ اور اس کی امی کو تیار کیا۔ ایسی جلدی میں چونکہ زبیدہ کے پاس کوئی سینڈل نہ تھا، اس لیے اسے چپل پہن کر ہی اشیش آنا پڑا۔ اس کی امی نے بازار میں ایک دکان پر تانگہ رکوایا بھی، پر جیل کے ابایہ کہہ کر کہ ہوشیار پور چل کر سینڈل خرید لیں گے، انہیں شاپنگ کرنے کی اجازت نہ دی۔ چونکہ یہ لوگ سینڈل کا اس میں سفر کر رہے تھے، اس لیے زبیدہ سارا وقت سیٹ پر اکڑوں بیٹھی رہی اور اس نے اپنے پاؤں سیٹ کے نیچے چھپائے رکھے۔ جالنڈھر سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہوشیار پور والی گاڑی دو گھنٹے بعد روانہ ہو گی۔ زبیدہ کی امی نے جیل کے ابایہ سے درخواست کی کہ وہ زبیدہ کو بازار لے جا کر سینڈل خرید دیں۔ انہوں نے درد کرتے سر کو دونوں ہاتھوں میں ہام کر کر یہ ڈیوٹی جیل کے پردہ کر دی۔ جب وہ دونوں سٹیشن سے باہر نکلے تو جیل کے پاس پچھی کادیا ہوا پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ گرہ سے کھولتے وقت پچھی نے خاص طور پر تائید کی تھی کہ سینڈل چار ساڑھے چار روپے سے زیادہ کا نہ ہوا اور تانگے کا کرایہ بھی اسی میں سے ادا کیا جائے! جب وہ تانگے پر سوار ہوئے اور جیل بھی زبیدہ کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو زبیدہ کو نے میں سمٹ گئی۔ تھوڑی دور جا کر جیل نے کہا۔ ”تم بھی میری امی جیسا ریشمی برقع کیوں نہیں پہنچتی ہو؟ یہ تو مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ زبیدہ نے ہولے سے کھنکا کر گلا صاف کیا لیکن کوئی جواب نہ دیا اور جب وہ بازار میں داخل ہو گئے تو جیل نے کہا۔ ”جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمہارے لیے اچھے اچھے سینڈل لایا کروں گا اور۔۔۔“

زبیدہ نے ہولے سے جواب دیا۔ ”اس وقت تو آپ ہمیں بھول جائیں گے اور اگر اس وقت آپ نے مجھے سینڈل لا کر دیئے تو آپ کی بیوی بہت ناراض ہوا کریں گی۔“

جیل نے ہنس کر کہا۔ ”اگر سینڈل لانے پر بھی ناراض ہوئی تو ہوا کرے۔

ایک تو اس کے لیے سینڈل لاؤ، دوسرا سے اس کی ناراضگی برداشت کرو۔“

زبیدہ نے کہا۔ ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ایک دکان وہ سامنے ہے۔۔۔“

انہوں نے تانگہ رکوایا اور دکان میں داخل ہو گئے۔ نرم چڑڑے کا گندھا ہوا

ایک سینڈل زبیدہ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ بار بار اسے دیکھتی، پہنچتی اور پھر وہ فرش پر رکھ دیتی۔ لڑکا اسے کئی جوڑے دکھا کر تھا۔ پر اس کی طبیعت کسی پرنہ جنمی نہیں۔ اس نے اسی گندھے ہوئے سینڈل کو اٹھا کر کہا۔ ”زہرت کے پاس بھی یہ ہی ہے لیکن اس نے تو یہ بارہ روپے میں خریدا تھا۔“ پھر اس نے سیاہ رنگ کی ایک گرگابی پہن کر پوچھا۔ ”اس کی کیا قیمت ہے؟“

”سائز ہے چار روپے۔“ لڑکے نے اس پر کپڑا پھیر کر کہا۔

”بس یہ ہی ٹھیک ہے۔“ زبیدہ نے مجبور نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا اور گرگابی اتار دی۔ جمیل انٹھ کر دکاندار کے پاس چلا گیا۔ دکاندار نے لڑکے کو ڈبوں کے انبار اندر لانے کو کہا اور جب جمیل قیمت ادا کر کے اور ڈبے لے کر باہر نکلا تو اس کے قدم اصل مرغ کی طرح پڑتے تھے اور زبیدہ اس کے ساتھ بہت چھوٹی سی دکھائی دیتی تھی۔ تالے میں بیٹھ کر اس نے ڈبہ زبیدہ کے حوالے کیا اور کہا۔ ”لودیکھو، میری بیوی کوئی ناراض ہوتی ہے؟“

زبیدہ نے اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ”اب تو وہ ہے ہی نہیں، اگر ہوتی تو۔“

اس پر جمیل ہنس پڑا۔ ”ہے ہی نہیں۔ ہیا۔ ہے کیوں نہیں بھلا۔“

اور جب ڈھکنا کھلا تو ڈبے میں نرم چھڑے کا گندھا ہوا سینڈل پڑا تھا۔ زبیدہ نے کچھ کہنا چاہا تو جیسے اس کی زبان رک گئی۔ رینک بازار کے بیچوں بیچنے جانے جمیل کے دل میں کیا آئی کہ اس نے زبیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر شادی کروں گا تو تم ہی سے کروں گا۔ نہیں تو کروں گا ہی نہیں۔“

زبیدہ نے ہاتھ چھڑانا چاہا اور اس کی انگلیاں جمیل کے ہاتھوں سے لپٹ گئیں! لیکن سعدی میری بیجی! یہ کرہہ تاریک سائیوں ہو گیا ہے۔ شاید تم نے آتشدان میں لکڑیاں جھوکنی چھوڑ دی ہیں۔ شاید تمہیں نیند آرہی ہے اور تم اوٹکھنے لگی ہو۔ میں کیا کروں اور تمہیں کیسے سمجھاؤ کہ آج کے بعد میں تم سے ہمکلام نہ ہوں گا۔ پھر نہ تم میری آواز سن پاؤ گی، نہ مجھے پکار سکو گی اور تم اتنی ہی جاہل رہ جاؤ گی جتنی کہ تم عام طور پر ہوا کرتی ہو۔

جب ہم کانج میں پڑھا کرتے تھے تو ایک دن جمیل کو زبیدہ کا خط ملا کہ وہ اپنی

امی کے ساتھ پنڈی جا رہی ہے۔ اس لیے جمیل اسے اشیش پر آکر ملے۔ گاڑی شام کے وقت لاہور سے گزرتی تھی لیکن شام سے پہلے ہی اس کے لباؤنے اسے اپنے کرایہ داروں کے کرایہ نامے لکھنے پر لگا دیا۔ وہ ایک کرایہ نامہ لکھ کر اپنے ابا کی طرف دیکھتا۔ گھڑی کی طرف دیکھتا اور جیب کی طرف دیکھتا جس میں زبیدہ کا خط تھا، مگر وہ اتنا نہ کہہ سکا کہ ابا میں اس وقت یہ کرانے نامے نہیں لکھ سکتا۔ اب یہ دستاویزات تحریر نہیں کر سکتا۔ نہیں کسی اور وقت پر انہار کھیے۔ نہیں کسی اور سے لکھوا لیجئے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا نہیں! نہیں!! اور اس کا ہاتھ چل رہا تھا۔ ”میں اقرار کرتا ہوں کہ آج مورخہ۔“ وقت گزر گیا، گاڑی نکل گئی اور اس کا قلم چلتا رہا۔ تیسرے دن اسے زبیدہ کا مختصر ساخت ملا۔ ”تم بڑے بے وفا ہو جمیل۔“ اور وہ میرے پاس آ کر روپڑا میں جانتا تھا کہ وہ بے وفا نہیں ہے۔ بے ایمان نہیں، جھوٹا نہیں لیکن وہ کیا تھا؟ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اس وقت میں بھی تمہارے جیسا تھا۔ تم جتنا تھا اور میرا ذخیرہ الفاظ محدود تھا۔ پر اب میں جان گیا ہوں وہ کیا کیا تھا۔ جمیل بے وفا نہیں تھا یہ فیک تھا اور اب میری پیاری بچوں تم مجھ سے پوچھو گی کہ یہ فیک کیا ہوتا ہے لیکن اس کے معنی مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ پر تم اتنا کیا کرو کہ کسی مرد کو بے وفا کہنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ وہ یہ فیک تو نہیں۔ کہیں وہ جمیل تو نہیں۔ شاید وہ یہ فیک ہو اور تم اسے بے وفا بھجتی رہو، سنگدل بھجتی رہو، ہری چک بھجتی رہو۔

کالج کے زمانے میں جہاں اور بہت سی لڑکیاں ہماری ہم سبق تھیں، ایک نجمہ بھی تھی۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ جو کوئی ایک لمحے کے لیے اس سے ملتا، اس کا گرویدہ ہو جاتا لیکن وہ لڑکی بڑی خود سر قسم کی تھی۔ اس نے باتوں میں کسی کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ کسی کو لفت نہ دی تھی لیکن وہ اور جمیل کتابوں کی باتیں کرتے کرتے کچھ اور طرح کی گفتگو کرنے لگے اور ایک دن جب جمیل میرے پاس آیا تو اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور اس کے سنبھارے بال کھلے ہوئے سے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمام رات جا گتار ہا اور اپنے اللہ سے دعائیں مانگتار ہا اور جب آدمی رات ہوئی تو اس کے دل میں زبیدہ کی موت کی دعا اٹھی اور اسے رونا آگیا۔ وہی زبیدہ جس کا ہاتھ تھام کر اس نے ریک بازار کے بیچوں بیچ و عده کیا کہ اگر شادی ہوگی تو اسی سے ہوگی

ورنہ نہیں ہوگی۔ زبیدہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھونٹنے لگا۔ اس کے خطوط اس کے ذہن میں ابھرنے لگے اور وہ پچھتانا لگا کہ اس کی ملاقات زبیدہ سے کیوں ہوئی۔ سیدھی نجہ سے کیوں نہ ہو گئی! لیکن اس میں نہ تو زبیدہ کا قصور تھا اور نجہ کا اور نہ ہی جیل کا۔ یہ سارا کیا وہ رات ملاقات کا تھا جو ہو جایا کرتی ہے اور ہوتی رہتی ہے جس کی راہ میں چتاب ایسی ندیاں تو کیا اگر بڑے بڑے سمندر بھی آجائیں تو بھی اس کا سلسلہ ٹوٹا نہیں کرتا۔ دسمبر کی ایک تجسس رات کو جب جیل اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے ساری رات صرف ایک نیک پہن کر کوئی پر بیٹھا رہا تو مجھے اس کی بہت فکر ہوئی اور میں نے بڑی منتوں اور سماجوں کے بعد اس سے نجہ کے نام ایک خط لکھوایا کہ مجھے زبیدہ سے محبت ہے اور میں نے اس سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں۔ میں اسے دھوکا دینا نہیں چاہتا اور آپ کو بھی بہلاوے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔ مجھے اس سے بھی محبت ہے اور میں کسی کو نہیں چھوڑ سکتا اور اب میں نے تمام عمر شادی نہ کرنے کا فصلہ کر لیا ہے۔ شاید اس طرح سے میں اپنا عبد نباه سکوں۔

لیکن میری پیاری بچیو! نجہ نے اس خط کا جو جواب دیا وہ بڑا تکلیف دہ تھا اور اس نے بھی اسی غلطی کا اعادہ کیا تھا جو تم ازل سے کرتی آئی ہو۔ سعدی بیٹی یہ کمبل کا کنارہ میرے پاؤں تلے دے دو اور میری الماری سے وہ سیاہ صندوق پر انھالا و جس میں جیل کے نام آئے ہوئے سارے خط موجود ہیں مگر تھہراو! تم بس یہ کنارہ ہی میرے پاؤں تلے دبادو اور اس صندوق پر کورہنے دو۔ میں تمہیں وہ خط زبانی سناتا ہوں۔ مجھے وہ سارے خطوط حفظ ہو گئے ہیں اور میں انہیں بے ہوشی کی حالت میں بھی دھرا سکتا ہوں۔ نجہ نے جواب دیا۔ ”مجھے تم سے اس چیز کی توقع نہ تھی۔ ظاہری صورت سے تم ایسے دکھائی نہیں دیتے ہو، لیکن باطن کی خباثت جو خدا جانے اور کس کس کو آلووہ کرے گی، مجھ پر آج عیاں ہوئی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا، زبیدہ کو دھوکا دیا اور محبت جیسے پاکیزہ لفظ کو ایک سپلاش کیا۔ اگر تم یہ سب جانتے تھے تو مجھے پبلے ہی کیوں نہ بتایا۔؟ آغاز ہی میں مجھ پر ساری باتیں کیوں روشن نہ کر دیں اور شروع ہی میں مجھے اپنی زبیدہ کی کہانی کیوں نہ سنائی؟ تمہاری بے وقاری کا داغ میرے سینے میں ساری زندگی انگارے کی طرح دکھتا رہے گا۔ تمہاری ہر جائیت میری زندگی میں پھانس کی طرح کھکھلتی رہے گی اور تمہارا

وجود میرے لیے ایک چلتا پھر تا جھوٹ، ایک جیتا جاتا فریب بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد مجھے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔“

لیکن میری پیاری بچیو! وہ بے وفا نہیں تھی، یہ فیکتا تھی۔ جمیل جھوٹا یا فربی نہیں تھا۔ وہ یہ فیک تھا۔ اور اسے اپنی اور نجہ کی محبت کا آغاز اس وقت معلوم ہوا تھا جب وہ آغاز نہیں کر رہا تھا اور اسے میری سعدی کی سہیلیو! محبت کسی خاص تاریخ کو شروع نہیں ہوتی۔ دل موسم کے چنان میں کادفتر نہیں ہوتا اور۔۔۔ اور چاہت فرست یا سینڈ کلاس کا نکٹ نہیں ہوتی جس پر سفر کی تاریخ پہلے ڈال دی جاتی ہے۔ پھر بھلا آغاز کیا اور انعام کیا؟ لیکن اس وقت میں بھی یہ باتیں سوچ نہ سکتا تھا۔ میں بھی یہ رمزیں سمجھنے سے عاری تھا اور نجہ سے ضرور پوچھتا کہ بھلا اس نے کسی جولائی کی انیس یا کسی اگست کی سات تاریخ کو صبح کے سائز ہے دس بجے یا شام کو پونے چار بجے جو نہیں اس کی محبت شروع ہوئی، جمیل سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا کہ اسے کسی اور سے محبت تو نہیں؟ اور میری بچیو! محبت ریڈیو کا پروگرام نہیں جو سبھ بخنے پر شروع ہو جاتا ہے اور جس کی تفصیل پندرہ دن پہلے بتا دی جاتی ہے۔ نجہ کے یہ لکھنے پر کہ اس کے بعد مجھے ملنے کی کوشش نہ کرنا، جمیل نے وہ شہر ہی جھوڑ دیا اور پونا جا کر ایک انگریزی فرم میں ملازم ہو گیا۔ اپنے کام کے علاوہ وہ اپنے کلر کوں کا کام بھی کرتا۔ اپنے میجر کی ذمہ داریاں سنبھالتا اور وقت پڑنے پر اپنے چپڑی کے فرائض بھی خود ہی انعام دے لیا کرتا۔ وہ بے حد میٹھا آدمی تھا۔ سادہ لوح انسان تھا اور اس کا دل ذرا ذرا سی بات پر پتھج جایا کرتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارے جہان کے درد اکٹھے کر کے انہیں اپنے دل میں رکھ لے۔ انہیں اپنے تنفس کی ہوا دیتا رہے اور جب وہ لوڈے انھیں تو اس کا چھوٹا سا وجود جل جائے۔ لیزک واث اینڈ برادرز میں کام کرتے جب اسے ایک عرصہ گزر گیا تو وہ اپنا وطن بھول گیا۔ اپنا شہر بھول گیا اور اس نے اپنے سارے دوستوں کو بھلا دیا۔ ایک ہفتہ کے روز جب دفتر آؤ ہے دن کے بعد بند ہو گیا تو اس نے مس تیلہما کو چند ضروری کاغذات ثانپ کرنے کے لیے روک لیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پچھلے مینے کی کار گزاریوں کا خلاصہ تیار کرتا رہا اور تیلہما برآمدے کے آخری کونے پر لکڑی کے کاکب میں ثانپ کرتی رہی۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد جب وہ کاغذات کا پلندے لے کر آئی تو اس نے اپنا چھوٹا سارا ومال ماتھے پر پچھرا

اور کاغذات کا مٹھا جمیل کو دے کر کہنے لگی۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں اور میرے سر میں ہلکا ہلاکارہ ہونے لگا ہے۔ کیا میں اس کر سی پر بیٹھ کر ذرا استالوں؟“

”ضرور ضرور۔“ جمیل نے پاپ منہ سے نکال کر کہا۔ ”میں یہ چند سطریں لکھ لوں اس کے بعد ہم ریستو ان میں چل کر چائے پینے ہیں۔“

تیلما نے آنکھیں بند کر کے اپنا ما تھا کر سی کی پشت پر رکھا ہوا تھا۔ یہ بات سُن کر اس نے اپنے پوٹے جھپکے اور اسی طرح سر رکھے کہا ”مجھے ریستو ان جانا اچھا نہیں لگتا اور اگر مجھے جانا بھی پڑے تو میں ایکلی جاتی ہوں۔“

جمیل نے کہا۔ ”پھر چائے یہیں منگو والیتے ہیں۔ اس طرح کام بھی جلدی ختم ہو جائے گا اور تھکان بھی محسوس نہ ہوگی۔“

”شکر یہ۔“ یہ کہہ کر تیلما نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور جمیل نے گھنٹی بجا کر چوکیدار کو چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔

جب وہ دونوں چائے پینے بیٹھے تو جمیل نے کہا۔ ”میں تیلما آپ ہر وقت تھکی تھکی سی رہتی ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ غم جھلکتا رہتا ہے اور آپ بے حد خاموش رہتی ہیں۔— مجھے اس قسم کا ذاتی سوال ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ پر میں کیا کروں، یہ سوال مجھے کام نہیں کرنے دیتا، مجھے چین نہیں لینے دیتا اور میں سو نہیں سکتا۔“

تیلما کی کنجی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے اور ضبط کرنے کے باوجود ڈپ سے ایک قطرہ ٹرے میں گر پڑا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ با تھوں میں چھپالیا اور سکیاں لینے لگی۔ جمیل کر سی سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ اس کے پاس جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اب تو خواہ کچھ بھی ہو جائے میں یہ بات معلوم کیے بغیر نہیں رہوں گا۔ میں پہلے ہی کافی پریشان تھا لیکن اب تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ اس کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا اور اس کے کندھے کو آہستہ سے چھو کر کہنے لگا۔ ”اگر تم نے مجھے یہ راز شہ بتایا تو میں تم سے بھی بھی نہ بولوں گا۔“ یہ بات کہتے ہوئے جمیل بے حد جذباتی ہو گیا اور اس کا جی تیلما کو لکھجے سے لگا لینے کو چاہنے لگا۔ تیلما نے گہر بار آنکھوں اور نمنا کے گالوں والا چہرہ اور پر اٹھایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں کسی بے وفا مرد کی کہانی ایک اور مرد کو کیوں سناؤں؟ جب اس نے میرا ہوتے ہوئے بھی مجھ